ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2969

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(شعبہ شریعہ، کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ)

کورس: نظریات فقہیہ اور قواعد فقہیہ کا تعارف (2969) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ: 05 تا 09)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: قواعدِ کلیہ فقہیہ کی تعریف، تاریخی ارتقاء اور متعلقہ اصطلاحات سے فرق (20 نمبر)

سوال نمبر 1: 'قواعدِ کلیہ فقہیہ' کی تعریف اور اس کے تاریخی ارتقاء کا تفصیلی جائزہ لیں، نیز 'قاعدہ' اور 'ضابطہ' کے درمیان بنیادی فرق اور اصولِ فقہ و قواعدِ فقہیہ کا موازنہ واضح کریں۔ (20)

تمہید

فقہ اسلامی صرف جزئی مسائل کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک منظم علم ہے جس میں ہزاروں جزئیات کو چند جامع اصولوں کے تحت سمجھا جا سکتا ہے۔ ان جامع اصولوں کو قواعدِ کلیہ فقہیہ کہا جاتا ہے۔ یہ قواعد طالب علم اور فقیہ دونوں کے لیے رہنما چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی مدد سے نئے پیش آنے والے مسائل کو پرانے اصولوں کی روشنی میں حل کرنا ممکن ہو جاتا ہے اور پوری فقہ میں ایک نظم و ضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ اس جواب میں پہلے قواعدِ کلیہ کی تعریف بیان کی جائے گی، پھر ان کے تاریخی ارتقاء کا جائزہ لیا جائے گا، اور آخر میں قاعدے اور ضابطے کا فرق اور اصولِ فقہ و قواعدِ فقہیہ کا موازنہ پیش کیا جائے گا۔

قواعدِ کلیہ فقہیہ کی تعریف

قاعدہ کے لغوی معنی بنیاد اور اساس کے ہیں، اور کلیہ کا مطلب ہے عام اور اکثر جزئیات پر محیط۔ اصطلاح میں قاعدۂ فقہیہ وہ کلی شرعی حکم اور جامع اصول ہے جو اپنی بہت سی جزئیات اور فروعی مسائل پر منطبق ہوتا ہے اور ان میں یکساں حکم کی نشان دہی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ قاعدہ کہ امور اپنے مقاصد کے اعتبار سے پرکھے جاتے ہیں، عبادات، معاملات اور عقود سمیت زندگی کے بے شمار ابواب پر لاگو ہوتا ہے۔ فقہاء یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ قواعد عام طور پر اغلبی ہوتے ہیں، یعنی ان کی اکثر جزئیات پر حکم لاگو ہوتا ہے، مگر بعض جزئیات مستثنیٰ بھی ہو سکتی ہیں، کیونکہ فقہ کے بیشتر قواعد اجتہادی استخراج کا نتیجہ ہیں۔ قواعد کی یہی خصوصیت انہیں نصوص سے الگ کرتی ہے؛ نص قطعی ہوتی ہے جبکہ قاعدہ بہت سے جزئی مسائل کے استقراء اور مطالعے سے ترتیب پاتا ہے اور فقہاء کی علمی محنت کا شاہکار ہوتا ہے۔

قواعد کے تاریخی ارتقاء کا پہلا دور: بنیاد اور ابتدائی صورت

قواعدِ فقہیہ کا سلسلہ درحقیقت عہدِ نبوی اور صحابہ کے دور سے شروع ہوتا ہے، کیونکہ خود قرآن و سنت میں ایسے جامع جملے اور اصول موجود ہیں جنہوں نے بعد کے قواعد کی بنیاد فراہم کی، مثلاً ضرر کی ممانعت، مشقت پر آسانی اور یقین کی حفاظت جیسے تصورات۔ فقہاء کے دور میں جب فروعی مسائل کی تدوین شروع ہوئی تو انہی مسائل کے پیچھے کارفرما اصولوں کو بھی نوٹ کیا جانے لگا۔ ابتدائی ادوار میں قواعد الگ کتابوں کے بجائے اصول اور فروع کی کتابوں کے اندر منتشر صورت میں ملتے ہیں۔ امام کرخی جیسے فقہاء نے اپنے

مختصر رسالے میں چند بنیادی اصول جمع کیے جنہیں فقہِ حنفی کے قواعد کی ابتدائی دستاویزی صورت کہا جا سکتا ہے، اور امام دبوسی جیسے علماء نے اختلافِ فقہاء کے پیچھے اصولوں کو نمایاں کر کے اس فن کو آگے بڑھایا۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ قواعد زیادہ تر مسائل کی علت اور مناط کی صورت میں بیان ہوتے تھے۔

دوسرا دور: تدوین اور وسعت

بعد کے ادوار میں، خصوصاً پانچویں سے نویں صدی ہجری کے دوران، قواعد کے فن نے باقاعدہ کتابوں کی صورت اختیار کی۔ اس دور میں فقہاء نے مختلف ابواب سے اصول اخذ کر کے انہیں جامع انداز میں مرتب کیا۔ ابن عبد السلام نے قواعد کو مقاصد اور مصالح کی روشنی میں پیش کر کے اس فن کو ایک نئی جہت دی اور قرافی نے فروق اور قواعد کے فرق کو نمایاں کر کے اس میں مزید باریک بینی پیدا کی۔ اسی دور میں فقہ کے بڑے بڑے قواعد، خصوصاً پانچ بڑے کلی قواعد، واضح صورت میں سامنے آئے جن کے تحت سینکڑوں مسائل آ جاتے ہیں۔ اہلِ علم کے ہاں یہ بات مسلم ہے کہ اس فن کی تدوین نے فقہ کی تعلیم کو بہت آسان کر دیا، کیونکہ اب طالب علم کو ہر مسئلہ الگ یاد کرنے کے بجائے چند اصول یاد کر کے ان سے مسائل اخذ کرنے کی تربیت ملنے لگی۔

Figure: Historical development (irtaqa) of al-Qawaid al-Fiqhiyya



شکل: قواعدِ فقہیہ کے تاریخی ارتقاء کے نمایاں مراحل

تیسرا دور: اشباہ ونظائر اور مجلہ

اس فن کی سب سے نمایاں صورت اشباہ ونظائر کی کتابوں میں سامنے آئی، جن میں ملتے جلتے مسائل کو قواعد کے تحت جمع کیا گیا۔ ابن نجیم اور سیوطی جیسے علماء کی اس موضوع پر کتابیں آج بھی اس فن کی بنیادی مراجع سمجھی جاتی ہیں۔ جدید دور کے قریب عثمانی دور میں مجلۃ الاحکام العدلیہ کی صورت میں قواعد کو باقاعدہ قانون سازی کا حصہ بنا دیا گیا اور اس کے آغاز میں تقریباً ننانوے فقہی قواعد مضامین کی صورت میں درج کیے گئے۔ یہ واقعہ اس فن کی تاریخ کا سنگِ میل ہے، کیونکہ اس سے یہ بات عملی طور پر ثابت ہو گئی کہ قواعد محض علمی بحث نہیں بلکہ عدالتی فیصلوں اور قانون سازی کی عملی بنیاد بھی بن سکتے ہیں۔ بعد میں بھی مختلف ممالک کے فقہاء اور اکیڈمیوں نے قواعد کی شرح، ترتیب اور عصری تطبیق پر کام جاری رکھا ہے۔

قاعدہ اور ضابطہ کا فرق

قاعدے اور ضابطے میں بنیادی فرق ان کے دائرۂ کار کا ہے۔ قاعدہ وسیع اور کلی ہوتا ہے اور فقہ کے بہت سے ابواب پر لاگو ہوتا ہے، جیسے ضرر کو دور کرنے کا قاعدہ نماز سے لے کر معاملات تک ہر جگہ کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس ضابطہ تنگ دائرے کا اصول ہوتا ہے جو کسی ایک خاص باب یا ایک جیسے چند مسائل تک محدود رہتا ہے، مثلاً کسی ایک عبادت یا ایک خاص عقد کے اندرونی اصول۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ قاعدہ اکثر مختلف مذاہب کے فقہاء کے ہاں مشترک اہمیت رکھتا ہے، جبکہ ضابطہ زیادہ تر کسی خاص مکتبِ فکر یا خاص باب کی تفصیلات سے جڑا ہوتا ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ قاعدے سے عام حکم نکلتا ہے جبکہ ضابطہ اس خاص باب کے اندر نظم وضبط پیدا کرنے کا کام کرتا ہے۔ سادہ مثال یوں سمجھیں کہ قاعدہ پورے باغ کا اصول ہے اور ضابطہ کسی ایک کیاری کا۔

جدول 1: قاعدہ اور ضابطہ کا موازنہ

پہلو	قاعدہ	ضابطہ
دائرۂ کار	وسیع؛ فقہ کے کئی ابواب پر لاگو	محدود؛ ایک باب یا چند مخصوص مسائل تک

کسی ایک عقد یا عبادت کے داخلی اصول	ضرر دور کیا جائے گا؛ امور مقاصد سے پرکھے جاتے ہیں	مثال کی نوعیت
زیادہ تر خاص کتب یا باب سے متعلق	اکثر مذاہب میں مقبول و مستعمل	مشترکہ حیثیت
خاص باب کے اندر نظم و ترتیب	فقہ بھر میں یکساں حکم کی رہنمائی	مقصد

اصولِ فقہ اور قواعدِ فقہیہ کا موازنہ

اصولِ فقہ اور قواعدِ فقہیہ قریبی رشتہ رکھنے کے باوجود دو الگ علوم ہیں۔ اصولِ فقہ کا موضوع دلائل سے احکام اخذ کرنے کے طریقے ہیں، یعنی قرآن و سنت، اجماع اور قیاس جیسے ذرائع سے حکم کس طرح نکالا جائے، دلائل میں تعارض ہو تو ترجیح کیسے دی جائے اور عام و خاص، مطلق و مقید جیسے مباحث کیسے حل ہوں۔ اس کے برعکس قواعدِ فقہیہ کا موضوع خود احکام اور ان کے مشترک اصول ہیں، یعنی جو فروعی احکام پہلے سے ثابت ہیں ان میں جو کلی یکسانیت پائی جاتی ہے اسے قاعدے کی صورت میں بیان کرنا۔ ایک اور فرق یہ ہے کہ اصولِ فقہ کا تعلق استدلال کے مرحلے سے ہے جو حکم سے پہلے آتا ہے، جبکہ قواعد کا تعلق احکام کے بعد کی تنظیم اور تطبیق سے ہے۔ دونوں کا جاننا فقیہ کے لیے ضروری ہے، کیونکہ اصولِ فقہ حکم بنانے کی کسوٹی دیتا ہے اور قواعدِ فقہیہ بنے ہوئے احکام کو سمجھنے، یاد رکھنے اور نئے مسائل پر لاگو کرنے کی سہولت فراہم کرتے ہیں۔

جدول 2: اصولِ فقہ اور قواعدِ فقہیہ کا موازنہ

پہلو	اصولِ فقہ	قواعدِ فقہیہ
موضوع	دلائل سے احکام اخذ کرنے کے طریقے	ثابت شدہ احکام کے کلی اصول
مرحلہ	حکم کے استخراج سے پہلے	احکام کی تنظیم و تطبیق کے بعد

الیقین لایزول بالشک، المشقۃ تجلب التیسیر	امر و نہی، عام و خاص، قیاس	نمونے
مسائل کی حفظ، فہم اور نئی تطبیق	اجتہاد کی کسوٹی اور رہنمائی	فائدہ

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قواعدِ کلیہ فقہیہ وہ جامع اصول ہیں جو فقہ کے بے شمار جزئی مسائل کو ایک نظم میں پروتے ہیں۔ ان کا سفر نصوص کے جامع اصولوں سے شروع ہو کر فقہاء کے استخراج، اشباہ و نظائر کی تدوین اور مجلہ کی قانون سازی تک پہنچا۔ قاعدہ وسیع اور کثیر الابواب اصول ہے جبکہ ضابطہ محدود باب کا اصول ہے، اور اصولِ فقہ احکام اخذ کرنے کا علم ہے جبکہ قواعدِ فقہیہ احکام کو منظم کر کے لاگو کرنے کا علم ہے۔ ان تمیزات کو سمجھے بغیر فقہ کی ساخت کو مکمل طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

سوال نمبر2: الأمور بمقاصدھا اور الیقین لایزول بالشک کی تشریح و تطبیق (20نمبر)

سوال نمبر2: اہم عمومی قواعدِ فقہیہ "الأمور بمقاصدھا" اور "الیقین لایزول بالشک" کی جامع تشریح و تفریعات بیان کریں اور شرعی و عملی احکام میں ان کے تطبیقی مظاہر کی وضاحت کریں۔(20)

تمہید

قواعدِ فقہیہ میں سے پانچ قواعد کو بڑے اور جامع قواعد کی حیثیت حاصل ہے جن کے تحت فقہ کے بیشتر مسائل آ جاتے ہیں۔ ان میں سے دو قاعدے اس سوال کا موضوع ہیں۔ پہلا قاعدہ الأمور بمقاصدھا ہے جو اعمال کی قدر و قیمت ان کی نیت اور مقصد سے جوڑتا ہے، اور دوسرا قاعدہ الیقین لایزول بالشک ہے جو ثابت شدہ حالت کو محض شبے کی بنا پر ختم ہونے سے بچاتا ہے۔ یہ دونوں قاعدے عبادات سے لے کر عدالتوں کے فیصلوں تک روزمرہ عملی زندگی میں کام کرتے ہیں۔ اس جواب میں دونوں قواعد کی تشریح، ان کے فقہی ماخذ، ان سے نکلنے والی تفریعات اور ان کے تطبیقی مظاہر بیان کیے جائیں گے۔

قاعدہ اوّل: الأمور بمقاصدھا کا مفہوم

اس قاعدے کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ تمام امور کا فیصلہ ان کے مقاصد کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی عمل کی شرعی حیثیت، ثواب و گناہ اور قانونی نتیجہ طے کرتے وقت اس کے پس منظر میں موجود نیت اور مقصد کو سرور دیکھا جائے گا۔ اس قاعدے کی بنیاد مشہور حدیث ہے جس کا مفہوم ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی۔ اسی اصول کی بنا پر دو بظاہر ایک جیسے عمل نیت کے فرق سے بالکل مختلف حکم رکھتے ہیں۔ غسل اگر عبادت کی نیت سے ہو تو ثواب کا ذریعہ بنتا ہے اور محض ٹھنڈک کے لیے ہو تو مباح جسمانی عمل رہتا ہے۔ اسی طرح کسی کو رقم دینا نیت کے اعتبار سے ہدیہ بھی ہو سکتا ہے، قرض بھی اور صدقہ بھی، اور ہر صورت کے احکام دوسری سے الگ ہیں۔

الأمور بمقاصدھا کی تفریعات

اس قاعدے سے فقہ کے اندر بہت سی تفریعات نکلی ہیں۔ پہلی تفریع یہ ہے کہ عقود میں الفاظ کے بجائے معانی اور مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے، یعنی اگر کسی عقد کے الفاظ مختلف ہوں مگر حقیقی مقصد ایک ہو تو حکم اسی مقصد کے مطابق ہو گا۔ دوسری تفریع یہ ہے کہ وسیلے کو مقصد کا حکم ملتا ہے، یعنی اچھے مقصد کا جائز وسیلہ بھی پسندیدہ اور برے مقصد کا وسیلہ بھی ممنوع ہوتا ہے۔ تیسری تفریع عبادات میں نیت کی شرط ہے، جہاں نیت کے بغیر عبادت کی شرعی صورت ہی قائم نہیں ہوتی۔ چوتھی تفریع یہ ہے کہ جو عمل بظاہر مباح ہو مگر اس کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا یا حرام تک پہنچنا ہو تو وہ اپنے مقصد کی وجہ سے ممنوع ہو جاتا ہے، اور یہی نکتہ تعسف کے تصور سے بھی جڑا ہوا ہے۔ پانچویں تفریع یہ ہے کہ الفاظ کی تفسیر میں بولنے والے کے قصد اور عرفی مراد کو دیکھا جاتا ہے، اسی لیے قسم، اقرار اور وصیت جیسے ابواب میں نیت اور قرائن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

الأمور بمقاصدھا کے تطبیقی مظاہر

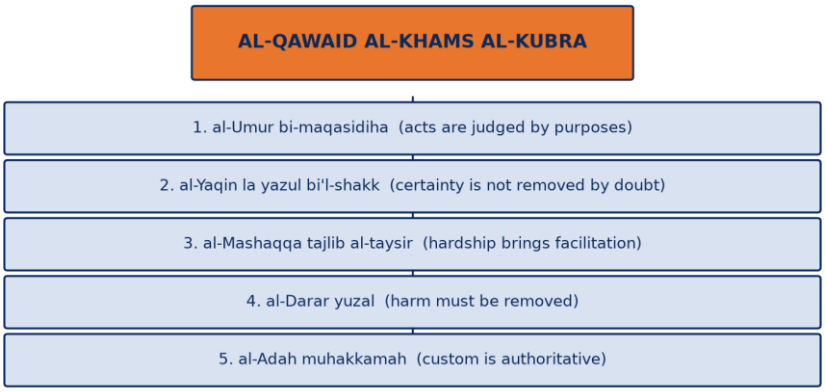
عملی زندگی میں اس قاعدے کے مظاہر ہر طرف نظر آتے ہیں۔ عدالت میں کسی معاہدے کی حقیقی نوعیت طے کرتے وقت جج اس کے عنوان کے بجائے اس کے اصل مقصد اور شرائط کو دیکھتا ہے۔ سماجی امور میں کسی شخص کی طرف سے دوسرے کی مدد نیت کے اعتبار سے احسان، اشتہار یا سیاسی مقصد ہو سکتی ہے اور اس کی اخلاقی درجہ بندی اسی نیت

سے ہوتی ہے۔ شرعی سطح پر یہی قاعدہ مکلف کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ ہر نیک عمل سے پہلے اپنی نیت درست کرے۔ یہ بات بھی ضروری ہے کہ نیت کا معاملہ اصلاً اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اس لیے دنیاوی فیصلوں میں عدالت ظاہری قرائن اور ثبوت پر فیصلہ کرتی ہے، اور کسی شخص کی مخفی نیت پر حتمی فیصلہ صادر کرنا انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اصولی تعلیم یہ ہے کہ مقصد عمل کی روح ہے اور اسی سے عمل کی اخلاقی حیثیت متعین ہوتی ہے۔

قاعدہ دوم: الیقین لا یزول بالشک کا مفہوم

اس قاعدے کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز یقین کے ساتھ ثابت ہو چکی ہو وہ محض شک اور شبہ کی وجہ سے ختم نہیں ہوتی۔ یقین سے مراد وہ محکم علم اور ثابت شدہ حالت ہے جس پر کوئی معقول شبہ نہ ہو، اور شک سے مراد ایسی غیر یقینی کیفیت ہے جس میں آدمی دو طرفوں کے درمیان فیصلہ نہ کر سکے۔ اس قاعدے کی بنیاد سنت کے اس اصول پر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان ایسی یقینی حالت کو شک کی بنا پر نہ چھوڑے جس پر وہ پہلے مطمئن تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی دینی اور دنیاوی زندگی بے جا وسوسوں اور بے بنیاد اندازوں سے محفوظ رہ جاتی ہے اور قانونی معاملات میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہر شک پر ثابت شدہ معاملات کھل جاتے تو نہ عبادت میں سکون رہتا اور نہ بازار اور عدالت میں اعتماد۔

Figure: The five major universal maxims of fiqh



شکل: پانچ بڑے کلی قواعدِ فقہیہ جن میں مذکورہ دو قاعدے بھی شامل ہیں

الیقین لایزول بالشک کی تفریعات

اس قاعدے سے بھی کئی اہم ذیلی اصول نکلے ہیں۔ پہلی تفریع اصل کا قاعدہ ہے، یعنی اصل یہ ہے کہ ذمہ کسی التزام سے بری ہے، لہٰذا دعویٰ کرنے والے پر ثبوت لازم آتا ہے اور محض شبے سے کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی۔ دوسری تفریع یہ ہے کہ اصل عدم ہے، یعنی کسی چیز کے وجود کا یقین نہ ہو تو اسے موجود نہیں سمجھا جائے گا۔ تیسری تفریع یہ ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے، یعنی جب تک کسی چیز کی حرمت یقینی دلیل سے ثابت نہ ہو اسے مباح سمجھا جائے گا۔ چوتھی تفریع استصحاب کا اصول ہے، یعنی جو حالت پہلے یقینی طور پر قائم تھی اسے اس وقت تک باقی سمجھا جائے گا جب تک اس کے خلاف یقینی دلیل نہ مل جائے۔ پانچویں تفریع یہ ہے کہ یقین کو صرف اسی جیسا یقین ختم کرتا ہے، یعنی قطعی ثبوت کا مقابلہ ظن اور گمان نہیں کر سکتا۔

الیقین لایزول بالشک کے تطبیقی مظاہر

اس قاعدے کا سب سے روزمرہ مظہر عبادات میں نظر آتا ہے، جہاں نمازی کو رکعتوں کی تعداد یا وضو کے باقی رہنے میں شک ہو جائے تو وہ اپنے سابقہ یقین پر بناء کرتا ہے اور وسوسے کی پیروی نہیں کرتا۔ عدالتی میدان میں اسی قاعدے کی عملی صورت یہ اصول ہے کہ ملزم اس وقت تک بے گناہ سمجھا جاتا ہے جب تک جرم یقین کے درجے کے ثبوت سے ثابت نہ ہو جائے، اور شک کا فائدہ ملزم کو ملتا ہے۔ مالی معاملات میں بھی یہی حال ہے کہ قرض جب یقین سے ثابت ہو تو ادائیگی کا یقین پیدا ہوئے بغیر ذمہ ختم نہیں ہوتا، اور جب ادائیگی یقینی طور پر ہو جائے تو محض شبے سے اسے دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ خاندانی اور شہری ریکارڈ کے معاملات میں بھی ثابت شدہ حالت کو برقرار رکھنا اسی قاعدے کی تطبیق ہے۔ البتہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ احتیاط چھوڑ دی جائے؛ جہاں شرعی احتیاط خود درکار ہو وہاں فقہاء کی ہدایات الگ ہیں اور اسی لیے ہر مقام پر قاعدے کا اطلاق اہلِ علم کی رہنمائی سے ہونا چاہیے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ الاُمور بمقاصدھا نیت اور مقصد کو عمل کی شرعی قدر کا معیار بناتا ہے اور الیقین لایزول بالشک ثابت شدہ حالت کو شک کے ہاتھوں ختم ہونے سے بچاتا ہے۔ پہلی تفریعات عقود میں معانی کے اعتبار، وسائل کے حکم اور عبادات میں نیت کی شرط تک جاتی ہیں، جبکہ دوسرے کی تفریعات براءتِ ذمہ، اباحتِ اشیاء اور استصحاب تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دونوں قاعدے مل کر یہ سبق دیتے ہیں کہ شریعت ظاہر پرستی کے بجائے حقیقت پسندی اور استحکام کی علمبردار ہے۔

سوال نمبر 3: عقدِ بیع میں ایجاب و قبول، مجلسِ عقد اور ثمن و مبیع کی شرائط (20 نمبر)

سوال نمبر 3: عقدِ بیع میں ایجاب و قبول کی شرائط اور مجلسِ عقد کے احکام و قواعد بیان کریں، نیز بیع میں ثمن اور مبیع کی بنیادی شرائط و اوصاف تفصیلاً تحریر کریں۔ (20)

تمہید

بیع یعنی خرید و فروخت انسانی معیشت کی سب سے بنیادی اور قدیم ترین صورت ہے۔ فقہ اسلامی نے بیع کو جائز رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ارکان اور شرائط کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ فریقین کے درمیان نہ جہالت رہے، نہ دھوکا اور نہ مستقبل میں تنازع۔ بیع کے ارکان میں سب سے پہلا رکن ایجاب و قبول ہے، یعنی بیچنے والے کی پیشکش اور خریدار کی منظوری، اور اسی کے ساتھ مجلسِ عقد، ثمن اور مبیع کی شرائط اس پورے نظام کو مکمل کرتی ہیں۔ اس جواب میں ان تمام پہلوؤں کو ترتیب وار بیان کیا جائے گا تاکہ طالب علم سمجھ سکے کہ ایک صحیح بیع کن شرائط پوری ہونے پر وجود میں آتی ہے۔

ایجاب اور قبول کی تعریف

ایجاب سے مراد وہ پہلا کلام یا عمل ہے جس سے ایک فریق عقد کی تجویز پیش کرتا ہے، مثال کے طور پر بیچنے والا کہے کہ میں نے یہ چیز اتنی قیمت پر بیچی۔ قبول سے مراد دوسرے فریق کا اسی تجویز کو اسی مجلس میں منظور کر لینا ہے، مثال کے طور پر خریدار کہے کہ میں نے خرید لی۔ فقہاء کے مطابق بیع الفاظ سے بھی منعقد ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں

فریقین کے عملی تعامل سے بھی، جسے معاطات کہا جاتا ہے، جیسے دکان پر قیمت دے کر چیز لے لینا جہاں رواج ہی اسی کو عقد سمجھتا ہو۔ ایجاب و قبول عقد کی رضامندی کا اظہار ہے، اور اسی لیے اس میں دونوں فریقوں کی آزاد رضامندی، اہلیت اور واضح اظہار بنیادی شرط ہے۔ زبردستی یا دھوکے سے حاصل کیا گیا قبول شرعی اعتبار سے وہ حیثیت نہیں رکھتا جو آزاد رضامندی کو حاصل ہوتی ہے۔

ایجاب و قبول کی شرائط

فقہاء نے ایجاب و قبول کی چند اہم شرائط بیان کی ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ قبول ایجاب کے مطابق ہو، یعنی جس چیز اور جس قیمت پر پیشکش ہوئی ہو قبول بھی اسی کے مطابق ہو؛ اگر خریدار قیمت یا چیز بدل کر جواب دے تو وہ قبول نہیں بلکہ نیا ایجاب سمجھا جائے گا۔ دوسری شرط اتحادِ مجلس ہے، یعنی ایجاب اور قبول ایک ہی نشست اور رابطے میں ہوں اور درمیان میں ایسا وقفہ یا دوسری طرف توجہ نہ آئے جس سے تجویز ختم سمجھی جائے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ایجاب قبل سے پہلے ختم یا واپس نہ لیا گیا ہو۔ چوتھی شرط فریقین کی اہلیت ہے، یعنی وہ عاقل اور تصرف کے قابل ہوں، اور اگر کوئی نابالغ یا دوسرے کی طرف سے وکیل ہو تو اس کے احکام علیحدہ ہیں۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ ایجاب و قبول ماضی یا حال کے ایسے صیغے میں ہو جس سے فی الحال عقد کا ارادہ سمجھا جائے، یا عرف میں مقبول عملی صورت اختیار کی جائے۔ خط و کتابت، پیغام اور جدید ذرائع سے ہونے والے معاملات میں بھی فقہاء نے انہی اصولوں کو حالات کے مطابق تطبیق دی ہے اور آج کل تحریری اور الیکٹرانک تصدیق کو بھی انہی اصولوں کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔

مجلسِ عقد کے احکام و قواعد

مجلسِ عقد سے مراد وہ نشست، ملاقات یا رابطے کی کیفیت ہے جس میں ایجاب و قبول کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اس مجلس کا پہلا حکم یہ ہے کہ جب تک مجلس قائم ہے اور دوسرے فریق نے قبول نہیں کیا، ایجاب کرنے والا اپنی پیشکش واپس لے سکتا ہے۔ دوسرا اہم حکم خیارِ مجلس سے متعلق ہے، یعنی بعض فقہاء کے مطابق جب تک فریقین مجلس سے جدا نہ ہوں انہیں عقد پر نظرِ ثانی کا اختیار رہتا ہے، جبکہ دیگر فقہاء کے ہاں قبول ہوتے ہی عقد لازم ہو جاتا ہے؛ اس اختلاف کو فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور عملی اطلاق میں مجاز قانون اور متعلقہ مکتبِ فکر کی پیروی کی جاتی ہے۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ مجلس میں کسی ایسے کام میں مشغول ہو جانا جو عقد سے بے تعلقی کا اظہار ہو، پیشکش کو ختم کرنے کے

مترادف سمجھا جاسکتا ہے۔ چوتھا حکم یہ ہے کہ مجلس کی وحدت کا فیصلہ عرف سے ہوتا ہے، چنانچہ ٹیلی فون یا آن لائن رابطے میں مسلسل گفتگو ایک مجلس شمار ہو سکتی ہے، جبکہ خطوط کے تبادلے میں وصولی اور جواب کے اوقات اہمیت رکھتے ہیں۔ ان قواعد کا مقصد یہی ہے کہ فریقین کو سوچنے سمجھنے کا پورا موقع ملے اور کوئی جلد بازی میں غیر ارادی طور پر عقد کا پابند نہ ہو جائے۔

مبیع کی بنیادی شرائط واوصاف

مبیع اس چیز کو کہتے ہیں جو بیچی جا رہی ہو۔ اس کی اہم شرائط درج ذیل ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ مبیع شرعاً مال ہو، یعنی ایسی چیز جسے عرف میں مال سمجھا جائے اور اس سے جائز فائدہ اٹھایا جا سکے؛ حرام اور ناپاک اشیاء کی خرید و فروخت اسی شرط کی بنا پر ممنوع ہوتی ہے مگر ان کی تفصیلات فقہاء کے ہاں مختلف ابواب میں آتی ہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مبیع موجود یا اس کی فراہمی ممکن ہو؛ ایسی چیز کی بیع جو سرے سے موجود ہی نہ ہو اور فراہم بھی نہ ہو سکے فریقین کو تنازعے میں ڈالتی ہے، البتہ سلم اور استصناع جیسی مخصوص صورتوں کے احکام شرعی ضوابط کے ساتھ الگ بیان ہوتے ہیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ مبیع معلوم اور متعین ہو، یعنی اس کی جنس، مقدار اور اوصاف اس قدر واضح ہوں کہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ مبیع بیچنے والے کی ملکیت میں ہو یا وہ اسے بیچنے کا شرعی اختیار رکھتا ہو، کیونکہ دوسرے کی چیز اس کی اجازت کے بغیر بیچنا ناجائز ہے۔ پانچی شرط یہ ہے کہ مبیع خریدار کے حوالے کرنا ممکن ہو؛ جو چیز سپرد ہی نہ کی جا سکے اس کی بیع معتبر نہیں ہوتی۔

ثمن کی بنیادی شرائط واوصاف

ثمن وہ قیمت ہے جو مبیع کے بدلے دی جاتی ہے۔ اس کی پہلی شرط معلوم ہونا ہے، یعنی قیمت کی مقدار اور جنس عقد کے وقت اس قدر واضح ہو کہ کسی ابہام کا امکان نہ رہے؛ قیمت مجہول رکھ کر عقد کرنا تنازعے کو دعوت دیتا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ثمن شرعاً مال ہو اور اس کی ادائیگی ممکن ہو۔ تیسری شرط ادائیگی کی میعاد کی وضاحت ہے؛ اگر قیمت ادھار ہے تو اس کی مدت متعین ہونی چاہیے، کیونکہ نامعلوم میعاد جہالت پیدا کرتی ہے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ ثمن میں ایسا اضافی التزام نہ رکھا جائے جو سود یا ممنوع نفع کی صورت اختیار کر لے، کیونکہ بیع کی مشروعیت کا اصل مدار جائز تبادلے پر ہے۔ پانچی شرط یہ ہے کہ اگر ثمن کسی چیز کی صورت میں ہو تو اس کے اوصاف بھی اسی طرح واضح

ہوں جس طرح مبیع کے اوصاف ضروری ہیں۔ نقد اور ادھار، قسطوں کی صورت اور قیمت کی کمی بیشی جیسے عصری معاملات کو بھی فقہاء انہی بنیادی شرائط کی روشنی میں پرکھتے ہیں اور ان پر شرعی رائے اہلِ علم کے سامنے معاملے کی پوری تفصیل رکھ کر حاصل کی جاتی ہے۔

جدول 3: بیع کی اہم شرائط کا خلاصہ

مقصد	اہم شرائط	جز
رضامندی کا یقینی ثبوت	مطابقت، اتحادِ مجلس، اہلیت، واضح اظہار	ایجاب و قبول
سوچنے کا موقع اور ابہام کا خاتمہ	پیشکش کی بقا، واپسی کا اختیار، عرفی مدت	مجلسِ عقد
تنازعے اور دھوکے کی روک تھام	مال ہونا، معلوم و متعین ہونا، ملکیت و حوالگی ممکن ہونا	مبیع
ادائیگی میں وضاحت اور عدل	معلوم ہونا، ادائیگی ممکن ہونا، میعاد متعین ہونا	ثمن

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ بیع کی صحت کا سارا نظام چار چیزوں پر قائم ہے: درست ایجاب و قبول، مجلسِ عقد کے قواعد کی پابندی، مبیع کی شرعی اہلیت اور ثمن کی وضاحت۔ ان شرائط کا مقصد کاروبار کو مشکل بنانا نہیں بلکہ اسے دھوکے، سود اور تنازعے سے پاک کر کے محفوظ بنانا ہے۔ جب خرید و فروخت ان اصولوں کے مطابق ہوتی ہے تو بازار میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور یہی اعتماد کسی بھی صحت مند معیشت کی اصل بنیاد ہوتا ہے۔

سوال نمبر 4: تغیرِ احکام بتغیر ازمان اور المعروف عرفاکالمشروط شرطاً (20 نمبر)

سوال نمبر 4: اہم قاعدۂ فقہیہ "لا ینکر تغیر الأحکام بتغیر الأزمان" اور "المعروف عرفاکالمشروط شرطاً" کی شرعی وضاحت کریں اور زمانے کے عرف واحوال کی تبدیلی سے اجتہادی احکام پر پڑنے والے اثرات کی تفصیل تحریر کریں۔ (20)

تمہید

اسلامی شریعت کے احکام دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو نصوصِ قطعی پر مبنی ہیں اور ہر زمانے میں ایک جیسے رہتے ہیں، اور دوسرے وہ اجتہادی اور عرفی احکام ہیں جو لوگوں کے حالات، رواج اور مصالح کے تابع ترتیب پاتے ہیں۔ اس سوال کے دونوں قاعدے اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا قاعدہ یہ بتاتا ہے کہ زمانہ بدلنے سے اجتہادی احکام کے بدل جانے کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور دوسرا قاعدہ یہ کہتا ہے کہ جو بات عرف میں معروف اور رائج ہو وہ ایسی ہی سمجھی جائے گی جیسے عقد میں اس کی شرط لگا دی گئی ہو۔ اس جواب میں دونوں قواعد کی شرعی وضاحت، ان کی حدود اور احکام پر تبدیلیِ احوال کے اثرات بیان کیے جائیں گے۔

قاعدہ اوّل: لا ینکر تغیر الأحکام بتغیر الأزمان کی وضاحت

اس قاعدے کا مفہوم یہ ہے کہ اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانوں کے بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ یہ قاعدہ مجلۃ الاحکام العدلیہ کے مشہور قواعد میں شامل ہے۔ یہاں احکام سے مراد وہ احکام ہیں جن کی بنیاد عرف، عادت، مصلحت اور انسانی حالات پر ہو، نہ کہ وہ احکام جو قرآن و سنت کی قطعی نصوص سے ثابت ہوں۔ نماز کی فرضیت، سود کی حرمت اور چوری کی ممانعت جیسے احکام کسی زمانے کے بدلنے سے نہیں بدلتے۔ البتہ وہ اجتہادی فیصلے جو فقہاء نے اپنے دور کے رواج اور حالات کے پیشِ نظر کیے تھے، جب حالات بنیادی طور پر بدل جائیں تو بعد کے فقہاء ان میں نظرِ ثانی کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے احکام کی علت خود حالات تھے، اور جب علت بدل جائے تو اس پر مبنی حکم کا برقرار رہنا مقصدِ شریعت کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔

تبدیلیِ احکام کے شرعی ضوابط اور حدود

اس قاعدے کو سمجھنے کے لیے اس کی حدود جاننا بہت ضروری ہے، ورنہ اس سے غلط نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ پہلی حد یہ ہے کہ تبدیلی صرف اجتہادی اور عرفی احکام میں ہوتی ہے، نصّی احکام اس سے باہر ہیں۔ دوسری حد یہ ہے کہ تبدیلی کا فیصلہ انفرادی خواہش سے نہیں بلکہ اہلِ علم کے اجتہاد اور حالات کے صحیح مطالعے سے ہوتا ہے۔ تیسری حد یہ ہے کہ تبدیلی کی بنیاد واقعی حالات کی تبدیلی ہو، محض فیشن یا اکثریت کی پسند اس کے لیے کافی نہیں۔ چوتھی حد یہ ہے کہ نیا اجتہاد بھی مقاصدِ شریعت، عدل اور دفعِ ضرر کے اصولوں کے تابع رہے گا۔ پانچویں حد یہ ہے کہ تبدیلی کا دائرہ وہی ہو گا جہاں اصل حکم خود عرف اور حالت سے مشروط تھا۔ ان ضوابط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ قاعدہ شریعت کو بدلنے کا لائسنس نہیں بلکہ اس کے اجتہادی نظام کی حکمت اور لچک کا اظہار ہے۔

قاعدہ دوم: المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً کی وضاحت

اس قاعدے کا مفہوم یہ ہے کہ جو بات لوگوں کے عرف میں اس قدر معروف اور رائج ہو چکی ہو کہ ہر شخص اسے جانتا ہو، وہ قانونی طور پر ایسے ہی معتبر ہو گی جیسے فریقین نے اپنے عقد میں اس کی باقاعدہ شرط لگا دی ہو۔ اس قاعدے کی بنیاد یہ ہے کہ انسانی معاملات کا بڑا حصہ تحریری شرائط سے نہیں بلکہ رواج سے چلتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کاروبار میں ادائیگی کا ایک معمول رائج ہو، یا کرائے کے مکانات میں مرمت کی ذمہ داری کا ایک جانا پہچانا اصول ہو، تو فریقین کے درمیان الگ سے شرط نہ لکھی گئی ہو تب بھی فیصلہ اسی معروف عرف کے مطابق ہو گا۔ اسی سے ایک اور مشہور قاعدہ جڑا ہوا ہے کہ عادت کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے، یعنی العادۃ محکمۃ۔ یہاں یہ شرط بنیادی ہے کہ وہ عرف شریعت کی کسی نص یا بنیادی اصول سے متصادم نہ ہو، کیونکہ شریعت کے خلاف رائج ہو جانے والی بری رسم کو معتبر عرف نہیں سمجھا جاتا۔

عرف کی اقسام اور اس کے معتبر ہونے کی شرائط

فقہاء نے عرف کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ ایک تقسیم کے مطابق عرفِ قولی وہ ہے جس کا تعلق الفاظ کے رائج معانی سے ہو، یعنی کسی لفظ کا وہ معنی لیا جائے جو لوگوں میں رائج ہے، اور عرفِ فعلی وہ ہے جس کا تعلق لوگوں کے عملی رویے سے ہو۔ دائرے کے اعتبار سے عرف کبھی عام ہوتا ہے جو پورے معاشرے میں رائج ہو اور کبھی خاص ہوتا ہے جو

کسی علاقے، پیشے یا طبقے تک محدود ہو۔ عرف کے معتبر ہونے کی بنیادی شرائط یہ ہیں کہ وہ فیصلے کے وقت واقعی رائج اور عام ہو، کسی نص یا فریقین کی صریح شرط سے متصادم نہ ہو اور مستقل اور تسلسل رکھتا ہو۔ ان شرائط کے پورا ہونے پر عرف نہ صرف عقد کی تفسیر کرتا ہے بلکہ خاموش معاملات میں شرائط کا مقام بھی لے لیتا ہے، اور یہی اس قاعدے کی عملی روح ہے۔

جدول 4: دونوں قواعد کا موازنہ اور دائرۂ کار

پہلو	تغیر الأحکام بتغیر الأزمان	المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً
بنیادی مفہوم	اجتہادی احکام حالات بدلنے سے بدل سکتے ہیں	رائج عرف شرط کے قائم مقام ہوتا ہے
تعلق	زمانہ اور حالات کی تبدیلی سے	عقد کی تفسیر اور شرائط کے تعین سے
دائرہ	صرف اجتہادی و عرفی احکام	صرف وہ عرف جو نص سے متصادم نہ ہو
ثابت احکام پر اثر	نصّی احکام بدستور قائم رہتے ہیں	صریح شرط عرف پر مقدم رہتی ہے

عرف و احوال کی تبدیلی کے اجتہادی احکام پر اثرات

زمانے کی تبدیلی کے اجتہادی احکام پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں جن کی مثالیں فقہ کی تاریخ میں جا بجا ملتی ہیں۔ پہلا اثر طریقِ کار اور وسائل میں تبدیلی کا ہے، مثلاً دستاویزات، رجسٹریشن اور شہادت کے جدید ذرائع کو فقہاء نے پرانے اصولوں کی روشنی میں قبول کر لیا حالانکہ ان کی صورتیں ماضی سے مختلف ہیں۔ دوسرا اثر بازار اور تجارت کی صورتوں میں ہے، جہاں نئی تجارتی اقسام کو پرانے عقود کے اصولوں پر پرکھ کر احکام دیے جاتے ہیں۔ تیسرا اثر سماجی رسوم میں ہے، مثلاً مہر، کفالت اور اخراجات کے معیارات ہر دور کے عرف سے متعین ہوتے ہیں۔ چوتھا اثر فتویٰ کی تبدیلی کا ہے کہ ایک ہی مسئلے میں حالات بدلنے سے بعد کے فقہاء نے اپنے پیش رو سے مختلف رائے اختیار کی، کیونکہ ان کے سامنے حالات بدل چکے تھے۔ پانچواں اثر قانون سازی میں ہے کہ مسلم ریاستوں نے بہت سے عرفی اور انتظامی معاملات میں جدید ضوابط اختیار کیے ہیں، بشرطیکہ

وہ اصولِ شریعت سے نہ ٹکرائیں۔ ان تمام اثرات کا حاصل یہ ہے کہ شریعت اصولی طور پر قائم رہتی ہے مگر اس کے اجتہادی اطلاقات زندگی کے ساتھ ہم آہنگ رہتے ہیں، اور یہی اس دین کی بقا اور عالمگیریت کا راز بھی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ لا ینکر تغیر الأحکام بتغیر الأزمان کا قاعدہ اجتہادی احکام کی مشروط نوعیت کو بیان کرتا ہے اور المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً رائج عرف کو شرائط کا درجہ دیتا ہے۔ دونوں قواعد کی بنیاد عرف ہے، دونوں نصوص کے تابع ہیں اور دونوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات آسانی اور انصاف کے ساتھ چلتے رہیں۔ ان قواعد کو ان کی حدود کے ساتھ سمجھنا ہر طالبِ علم کے لیے ضروری ہے تاکہ نہ تو وہ شریعت کو جامد سمجھے اور نہ ہی اسے بغیر اصول کے بدلنے والا نظام سمجھ بیٹھے۔

سوال نمبر 5: ضرورت، دفعِ مفاسد اور مشقت و تیسیر کے قواعد (20 نمبر)

سوال نمبر 5: قواعدِ فقہیہ "الضرورات تبیح المحظورات"، "درء المفاسد مقدم علی جلب المصالح" اور "المشقۃ تجلب التیسیر" کی فقہی تشریح کریں اور اسلامی فقہ میں رخصت، سہولت اور دفعِ ضرر کے بنیادی اصول واضح کریں۔ (20)

تمہید

اسلامی فقہ کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتی۔ شریعت کا عمومی نظام عزیمت یعنی اصل احکام پر چلتا ہے، مگر ضرورت، مشقت اور مفاسد کے مواقع پر اس میں رخصت، سہولت اور تحفظ کا پورا نظام موجود ہے۔ اس سوال کے تینوں قاعدے اسی نظام کی بنیاد ہیں۔ پہلا قاعدہ ضرورت کی حالت میں ممنوع کی عارضی گنجائش بیان کرتا ہے، دوسرا قاعدہ مصلحت اور مفسدہ کے ٹکراؤ میں فیصلے کا اصول دیتا ہے، اور تیسرا قاعدہ بتاتا ہے کہ مشقت آسانی کو دعوت دیتی ہے۔ اس جواب میں

تینوں کی تشریح اور رخصت و دفعِ ضرر کے بنیادی اصول بیان کیے جائیں گے۔ واضح رہے کہ ان قواعد کا کسی خاص فرد یا واقعے پر اطلاق اہلِ علم اور مجاز اداروں کا کام ہے؛ یہاں تعلیمی اصول بیان کیے جا رہے ہیں۔

قاعدہ اوّل: الضرورات تبیح المحظورات کی تشریح

اس قاعدے کا مفہوم یہ ہے کہ حقیقی ضرورتیں ممنوع چیزوں کو بقدرِ ضرورت مباح کر دیتی ہیں۔ ضرورت سے مراد وہ شدید حالت ہے جس میں جان، دین، عقل، نسل یا مال جیسے بنیادی مقاصد کو حقیقی خطرہ لاحق ہو اور اس خطرے کو دور کرنے کا کوئی حلال راستہ دستیاب نہ ہو۔ قرآن مجید نے اضطراری حالت میں ممنوع اشیاء کے بقدرِ ضرورت استعمال کی اجازت کا اصول بیان فرمایا ہے اور یہی اس قاعدے کی اصل بنیاد ہے۔ اس قاعدے کے ساتھ ایک اور فقہی اصول لازماً جڑا ہوا ہے کہ ضرورت کو اس کی مقدار کے ساتھ ناپا جائے گا، یعنی جتنی ضرورت ہے اسی قدر گنجائش ہو گی، اس سے آگے بڑھتے ہی ممانعت واپس آ جائے گی۔ اسی طرح یہ بھی شرط ہے کہ ضرورت واقعی موجود ہو، محض خواہش یا سہولت پسندی کو ضرورت کا نام نہیں دیا جا سکتا، اور جیسے ہی ضرورت ختم ہو اجازت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

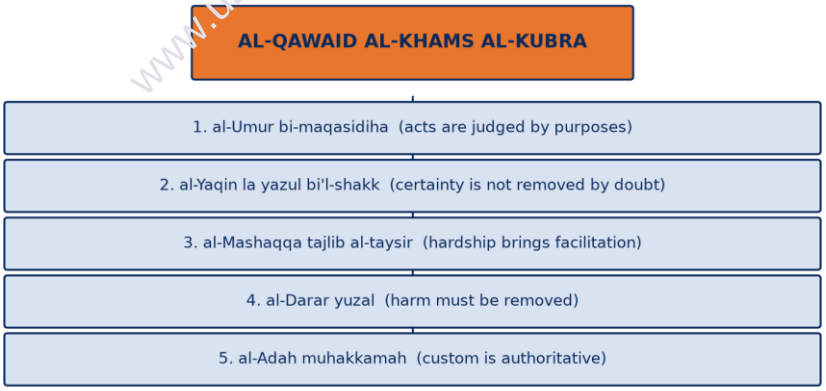
حاجت اور ضرورت کا فرق اور رخصت کی شرائط

فقہاء ضرورت اور حاجت میں فرق کرتے ہیں۔ ضرورت وہ انتہائی درجہ ہے جس میں بنیادی مقاصد کو خطرہ ہو، جبکہ حاجت وہ احتیاج ہے جس کے پورا نہ ہونے سے تنگی اور مشقت تو ہو مگر زندگی کا نظام نہ رکے۔ رخصت عام طور پر ضرورت کے درجے میں زیادہ واضح ہوتی ہے اور حاجت بعض صورتوں میں ضرورت کے قائم مقام بھی بن جاتی ہے، خصوصاً جب وہ عام لوگوں کو لاحق ہو۔ رخصت کے لیے فقہاء نے جو شرائط بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رخصت کا سبب شرعاً معتبر ہو، اس کا استعمال سبب کی موجودگی تک محدود ہو، رخصت سے کسی تیسرے شخص کے حق کو نقصان نہ پہنچے اور رخصت لینے والا خود اس تنگی کا ناحق سبب نہ بنا ہو۔ یہ شرائط اس لیے ضروری ہیں تاکہ رخصت کا ادارہ ذاتی خواہشات کا بہانہ نہ بن جائے اور فقہ کا توازن برقرار رہے۔

قاعدہ دوم: درء المفاسد مقدم علی جلب المصالح کی تشریح

اس قاعدے کا مفہوم یہ ہے کہ برائی اور نقصان کو دور کرنا بھلائی اور فائدے کے حصول پر مقدم ہے۔ جب کسی معاملے میں مصلحت اور مفسدہ دونوں پہلو موجود ہوں اور دونوں کو ایک ساتھ جمع کرنا ممکن نہ ہو تو فیصلہ یہ ہو گا کہ پہلے مفسدے کو دفع کیا جائے، خواہ اس کے لیے اس مصلحت کو عارضی طور پر چھوڑنا پڑے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقصان پہنچ جانے کے بعد اس کی تلافی عموماً مشکل ہوتی ہے، جبکہ رہ جانے والا فائدہ کسی اور صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس قاعدے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ جب دو مفسدے آپس میں ٹکرائیں تو ہلکے مفسدے کو اختیار کر کے بڑے مفسدے سے بچا جاتا ہے، اور جب دو مصلحتیں ٹکرائیں تو بڑی مصلحت کو چھوٹی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ پورا نظام درحقیقت مقاصدِ شریعت کے اس اصول کی عملی صورت ہے کہ شریعت انسان کے مفادات کی حفاظت کے لیے آئی ہے اور مفادات میں دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت سب سے مقدم ہے۔

Figure: The five major universal maxims of fiqh



شکل: بڑے کلی قواعد جن میں مشقت و تیسیر کا قاعدہ بھی شامل ہے

قاعدہ سوم: المشقۃ تجلب التیسیر کی تشریح

اس قاعدے کا مفہوم یہ ہے کہ مشقت آسانی اور تخفیف کو اپنے ساتھ لاتی ہے۔ جہاں اصل حکم پر عمل کرنے میں عام انسانی طاقت سے بڑھ کر مشقت لاحق ہو وہاں شریعت نے تخفیف اور رخصت دی ہے۔ اس قاعدے کی بنیاد قرآن مجید کے اس عمومی اصول پر ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے لیے آسانی چاہتا ہے، تنگی نہیں چاہتا، اور کسی جان کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اس قاعدے کے تطبیقی مظاہر عبادات میں بکثرت نظر آتے ہیں، مثلاً سفر میں نماز کی تخفیف، بیماری میں روزے کی رخصت، پانی نہ ملنے پر تیمم کی سہولت اور اضطرار میں عبادات کی صورتوں میں تبدیلی۔ فقہاء نے مشقت کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ایک وہ مشقت جو عبادت اور عمل سے الگ ہی نہیں ہوتی اور عام انسان اسے برداشت کر لیتا ہے، اس پر کوئی رخصت نہیں بنتی؛ اور دوسری وہ غیر معمولی مشقت جو عام برداشت سے بڑھ کر ہو، اسی پر تیسیر کا حکم مرتب ہوتا ہے۔ یہ امتیاز اس لیے ہے کہ دین میں کچھ نہ کچھ محنت اور مشقت عبادت کا فطری حصہ ہے۔

جدول 5: تینوں قواعد کا خلاصہ موازنہ

قاعدہ	بنیادی مفہوم	کلیدی شرط
الضرورات تبیح المحظورات	ضرورت ممنوع کو بقدرِ ضرورت مباح کرتی ہے	حقیقی ضرورت ہو اور مقدار سے تجاوز نہ ہو
درء المفاسد مقدم علی جلب المصالح	مفسدہ دور کرنا مصلحت لانے پر مقدم ہے	دونوں پہلوؤں کا صحیح وزن اور مقاصد کی رعایت
المشقۃ تجلب التیسیر	غیر معمولی مشقت تخفیف کا سبب بنتی ہے	مشقت عام برداشت سے بڑھ کر ہو

رخصت، سہولت اور دفعِ ضرر کے بنیادی اصول

ان تینوں قواعد سے اسلامی فقہ کے چند مشترک اصول سامنے آتے ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ رخصت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہے، اسے عزیمت کے ساتھ قبول کرنا بھی دین کا حصہ ہے اور بلاوجہ رخصت سے انکار کر کے اپنے اوپر سختی کرنا بھی درست روش نہیں۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر رخصت اپنے سبب کے ساتھ جڑی ہے؛ سبب ختم ہوتے

ہی اصل حکم لوٹ آتا ہے۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ ضرر کا ازالہ ہر صورت میں مقصود ہے، خواہ وہ عبادت کی تخفیف سے ہو، کسی معاملے کے التوا سے ہو یا نقصان کی تلافی سے۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ سہولت کا مقصد دین سے فرار نہیں بلکہ دین پر چلنا ممکن بنانا ہے، اس لیے رخصت ہمیشہ شرعی دائرے کے اندر ہوتی ہے۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ دفعِ ضرر میں ترتیب بھی ملحوظ رہتی ہے؛ پہلے اپنا ضرر دور کرنا اور دوسرے کو ضرر نہ پہنچانا دونوں بیک وقت مقصود ہیں، کیونکہ کسی کے ضرر کا ازالہ دوسرے پر ضرر ڈال کر نہیں کیا جا سکتا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تینوں قاعدے اسلامی فقہ کے رحمت اور توازن پر مبنی مزاج کا اظہار ہیں۔ ضرورت کے قاعدے نے شدید حالات میں بقدرِ ضرورت گنجائش دی، مفاسد کی تقدیم کے قاعدے نے فیصلوں میں نقصان سے بچاؤ کو پہلی ترجیح دی، اور مشقت کے قاعدے نے غیر معمولی تنگی پر تخفیف کی راہ کھول دی۔ ان سب کی مشترکہ بنیاد رخصت، سہولت اور دفعِ ضرر کے وہ اصول ہیں جو مکلف کو اس کی وسعت کے مطابق ذمہ داری دیتے ہیں اور شریعت کے احکام کو ہر حال میں قابلِ عمل رکھتے ہیں۔